مَلاكُ التأوِيل (۳)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورة البقرة

(۱۶) آیت ۶۰:

﴿فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَیۡنًا ؕ﴾

''پھر اس (چٹان) سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔''

اور سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿فَانۡۢبَجَسَتۡ﴾ (آیت ۱۶۰) حالانکہ دونوں کا معنی ایک ہی ہے' یعنی پھوٹ پڑنا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں موقعوں پر مختلف الفاظ کیوں استعمال ہوئے؟

جواب اس کا یہ ہے' واللہ اعلم' کہ اگرچہ دونوں الفاظ کا مطلب ایک ہی ہے لیکن بالکل برابر سرابر نہیں ہے۔ اِنبِجاس ' اِنفِجار کی ابتداء کو کہا جاتا ہے' گویا پانی کا پھوٹ پڑنا (اِنبجاس) ابتداء ہے اور پھر اس کا خوب اُچھل اُچھل کر آنا (اِنفجار) اس کی انتہا ہے۔

غزنوی[1] کہتے ہیں: ''انبجاس ' انفجار کی ابتداء کو کہا جاتا ہے۔''

ابن عطیہ کہتے ہیں: ''انبجست اور انفجرت ایک ہی ہیں لیکن اول الذکر دوسرے کی بہ نسبت خفیف شمار ہوتا ہے۔''

اب جب یہ بات طے ہوگئی تو ملاحظہ کیجیے کہ سورۃ الاعراف میں مطالبہ بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام سے تھا کہ ہمیں پانی فراہم کیا جائے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰىهُ قَوۡمُهٗۤ﴾ (آیت ۱۶۰)

---

(۱) اصحابِ تفسیر میں مندرجہ ذیل علماء کو غزنوی کی نسبت سے یاد کیا گیا ہے:
ابوعلی الغزنوی: تاجِ شریعت اور نظامِ اسلام کے لقب سے معروف ہیں۔
ابوالمکارم الغزنوی: تفسیر اور توحید کے عالم' جامع مسجد اصفہان میں ہر بدھ کو وعظ کی مجلس منعقد کیا کرتے تھے۔
محمود بن ابی الحسن نیشاپوری غزنوی: بیان الحق کے لقب سے معروف تھے۔ (الداؤدی ۲:۳۱۱)

''اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی جب ان کی قوم نے ان سے پانی کی فرمائش کی۔''

اور سورۃ البقرۃ میں بتایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے اپنی قوم کی فرمائش ذکر کی تھی' یعنی ابتداءً یہ قوم کا مطالبہ تھا جس کے لیے وہ لفظ استعمال ہوا جو ابتداء کے لیے مخصوص ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ ان کے مطالبے کی غایت (انتہاء) کے درجے میں تھا' کیونکہ وہ ان کے مطالبے کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا تھا' اس لیے یہاں وہ لفظ استعمال ہوا جو غایت یا انتہاء کے لیے خاص ہے' اور یوں ہر لفظ اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے مناسب تھا' اور اگر اس کا الٹ ہوتا تو وہ قطعاً مناسب نہ تھا۔ واللہ اعلم!

(۱۷) آیت ۶۱:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ﴾

''اور ان پر ذلت اور عاجزی مسلط کی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر پلٹے۔''

لیکن سورۃ آل عمران کی آیت ۱۱۲ میں ارشاد ہوا:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۗ﴾

''ان پر ذلت طاری کی گئی جہاں کہیں بھی وہ تھے سوائے اس کے کہ (انہیں چھوٹ ملی ہو) اللہ کی رسی سے یا لوگوں کی رسّی سے' اور وہ اللہ کا غضب لے کر پلٹے اور ان پر عاجزی طاری کی گئی۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس بات کا سورۃ البقرۃ میں پہلے ذکر کیا گیا ہے اسے سورۂ آل عمران میں بعد میں کیوں ذکر کیا گیا؟

اس کی توجیہہ یوں کی جاسکتی ہے' واللہ اعلم' کہ سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل کا کھانے کے ضمن میں چند حقیر چیزوں کا مطالبہ ذکر کیا گیا ہے کہ جن سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے بھی انسان کو ذلت اور پستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۗ﴾ (البقرۃ:۶۱)

''پس ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر کہ ہمارے لیے وہ چیزیں نکال دے جو زمین اُگاتی ہے' جیسے ترکاریاں' ککڑی' لہسن' دال اور پیاز۔''

اور ان کا یہ مطالبہ ان چیزوں کے بدلے میں تھا کہ جو انہیں بغیر کسی مشقت کے من وسلویٰ کی شکل میں مل رہی تھیں اور اسی لیے ان سے کہا گیا:

﴿اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۗ﴾ (البقرۃ:۶۱)

''اور کیا تم ایک بہترین چیز کے بدلے میں حقیر ترین چیز چاہتے ہو؟''

اس لیے جب انہوں نے ایسی چیزوں کا مطالبہ کیا جن کے حصول میں نہ صرف محنت اور مشقت پائی جاتی ہے بلکہ ان کے حصول کے لیے ذلت اور عاجزی کا بھی تجربہ ہوتا ہے' اس لیے سورۃ البقرۃ میں پہلے ذلت اور عاجزی کا

ذکر کیا گیا اور اس کے بعد ان پر اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا ذکر کیا گیا جو علم ازلی میں ان کے لیے مقدر کیا جا چکا تھا اور ہم اللہ کے غضب سے پناہ مانگتے ہیں —— البتہ سورۃ آل عمران میں اس آیت سے پہلے فرمایا گیا:

﴿لَنْ یَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ یُّقَاتِلُوْكُمْ یُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ١١١﴾

’’یہ تمہیں ستانے کے سوا اور زیادہ کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے‘ اگر لڑائی کا موقع آ جائے تو پیٹھ موڑ لیں گے‘ پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی۔‘‘

تو یہاں اس کے بعد اس چیز کو پہلے ذکر کیا گیا کہ جس کے ہوتے ہوئے نہ انہیں کوئی مضرت لاحق ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی فلاح و کامیابی یعنی اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہونا۔ لہٰذا یہاں مذکورہ آیت کی مناسبت سے غضب کا ذکر پہلے کیا گیا اور مسکنت و عاجزی کا بعد میں‘ واللہ اعلم!

(۱۸) آیت ۶۱:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ۭ﴾

’’یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے اور ناحق نبیوں کو قتل کیا کرتے تھے۔‘‘

اور سورۃ آل عمران کی آیت ۲۱ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ﴾

’’بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کیا کرتے ہیں اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں۔‘‘

اور پھر آیت ۱۱۲ میں ارشاد ہوا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۭ﴾

’’وہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کیا کرتے تھے۔‘‘

یہاں دو سوال وارد ہوتے ہیں:

(۱) کیا وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں ’’الحق‘‘ (الف لام کے ساتھ) لایا گیا اور آل عمران کی دونوں آیتوں میں حق (بغیر الف لام‘ یعنی تنکیر کے ساتھ) لایا گیا؟

(۲) پہلی دو آیتوں میں ’’نَبِیُّوْن‘‘ جمع سالم کے صیغہ کے ساتھ اور آخری آیت میں ’’اَنْبِیَآءَ‘‘ جمع تکسیر کے ساتھ لایا گیا۔

پہلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ ان تینوں آیات میں بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے جو اپنے کفر اور زیادتی میں ایک جیسے تھے‘ لیکن تیسری یا ان تینوں میں آخری آیت میں جن اسرائیلیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے‘ ان میں وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ پایا تھا‘ اور اپنی آنکھوں سے ان بشارتوں کے مصداق کو دیکھ لیا تھا جو ان کی کتاب میں آنحضور ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوئی ہیں‘ لیکن حق کو سراسر دیکھنے کے باوجود وہ اپنے کفر پر نہ صرف اڑے رہے بلکہ اس میں تمام حدیں پھلانگ گئے‘ اس لیے اس کفر صریح کے مرتکب لوگوں کے بارے میں یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ انہوں نے بغیر کسی شبہ یا سبب کے ان برائیوں کا ارتکاب کیا۔

’’بِغَیْرِ حَقٍّ‘‘ یعنی بغیر کسی شبہ یا سبب کے۔ اور اس عبارت میں نہ صرف ان کی بدحالی کی طرف اشارہ

ہے بلکہ ان کی شدید ترین مذمت بھی کی گئی ہے' کیونکہ ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کہہ کر صاف صاف اس بات کا اعلان ہو گیا کہ انہیں اپنے مذموم جرائم کے ارتکاب کے وقت ادنیٰ سا شبہ بھی لاحق نہ تھا۔ اور یہی بات سورۂ آل عمران کی پہلی آیت (۲۱) پر بھی صادق آتی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے کفر اور عناد میں بہت آگے جا چکے تھے' یعنی دونوں آیتوں کا مضمون ایک ہی تھا' اس لیے ''حق'' نکرہ صیغہ کے ساتھ لایا گیا۔

اب آیئے سورۃ البقرۃ کی آیت کی طرف جہاں ''بِغَيْرِ الْحَقِّ'' کہا گیا ہے۔

یہ آیت بنی اسرائیل کے ان اوّلین لوگوں کے بارے میں ہے جنہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ نہیں پایا۔ انہیں پہلے ان احسانات اور نعمتوں کی یاد دلائی گئی ہے جو ان پر کی گئیں' پھر ان کے کفر کی تصریح کی گئی' اور انہی آیات میں اس بات کا بھی تذکرہ کیا گیا کہ ان کے چند جرائم یا اکثر جرائم کو معاف کر دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ ان میں سے چند لوگ اس کفر میں مبتلا نہیں ہوئے جس میں ان کے اکثر لوگ ملوث پائے گئے تھے۔ اور کئی آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ ان کے تمام کے تمام لوگ گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے تھے' جیسے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا ......﴾ (البقرۃ:۵۹)

''تو ان میں سے جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہوں نے قول کو بدل ڈالا......''

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸﴾ (التوبۃ)

''اور ان کی اکثریت گنہگار تھی۔''

اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ لوگ' چاہے کتنا بھی ان کے جرائم اور زیادتیوں کا ذکر کیا جائے' وہ جھوٹ' بہتان بازی' باطل کا علی الاعلان پرچار اور بغاوت و زیادتی کی اس حالت کو نہیں پہنچے تھے جس پر وہ لوگ پہنچے جنہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ پایا' اپنی آنکھوں سے دلائل و براہین کو دیکھا' جیسے حیی بن اخطب اور اس کے معاصر یہود جنہوں نے نبی ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے ان لوگوں کے لیے ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' کا صیغہ استعمال کیا گیا' کیونکہ اسم معرفہ (الف لام کے ساتھ) نکرہ کے ہم پلہ نہیں ہے' یعنی ''بِغَيْرِ حَقٍّ'' (بغیر کسی سبب کے) ''بِغَيْرِ الْحَقِّ'' سے زیادہ قوت رکھتا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ جان کے بدلے جان کا قانون موجود ہے' شادی شدہ شخص کو زنا کی بنا پر رجم کیا جائے گا اور جس کا اعتراف انہوں نے خود نبی ﷺ کے سامنے کیا تھا۔ بظاہر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مرتد کی سزا قتل ہے' اور اس کا اشارہ موسیٰ علیہ السلام کے اس خطاب میں موجود ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے کیا تھا:

﴿وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۱﴾ (المائدۃ)

''اور پیٹھ موڑ کر پیچھے نہ پلٹو ورنہ ناکام و نامراد پلٹو گے۔''

بہرصورت وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ایمان لانے کے بعد وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو قتل کا موجب ہو سکتی ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام ان تمام باتوں سے بریٔ الذمہ ہیں۔ اس تناظر میں ''بغیر الحق'' کا لایا جانا اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ ''بغیر وجہ الحقِّ المُبیح للقتل'' یعنی بغیر کسی ایسی حقیقی وجہ کے جو قتل کو جائز ٹھہراتی

ہو۔گویا یہاں ''الحق'' کا الف لام عہد کے لیے ہے' یعنی ان موجباتِ قتل کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو ان کی شریعت میں قتل کو جائز ٹھہراتی تھیں۔ اور اس لحاظ سے دونوں آیات کا مقصد ایک جیسا نہیں رہا۔ یعنی آل عمران کی دونوں آیتیں' البقرۃ کی آیت سے مختلف ہیں۔ ان دونوں آیات سے پہلے وہ کچھ تفصیل نہیں آئی جو آیت البقرۃ سے پہلے آئی ہیں اور اسی طرح ان دونوں آیات میں جو لوگ مقصود ہیں ان کی وہ حالت نہیں جو آیت البقرۃ سے مقصود لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ واللہ اعلم!

دوسرے سوال کے بارے میں عرض ہے کہ جمع تکسیر علم والوں اور غیر علم والوں دونوں کے لیے استعمال ہوتی ہے' جبکہ جمع سالم اصلاً علم والوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے' لیکن کبھی کبھی دوسروں کے لیے بھی بطور تشبیہ اور الحاق استعمال کی جاسکتی ہے' جیسے سورۂ یوسف میں ستاروں اور شمس وقمر کے لیے ''ساجدین'' کا صیغہ لایا گیا۔ فرمایا: ﴿اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ﴿۴﴾﴾ (یوسف) ''میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں''۔ (جمع سالم کا صیغہ اس اعتبار سے کہ یہاں کواکب اور شمس وقمر سے مراد ماں باپ اور بھائی ہیں۔)

اب دیکھئے کہ سورۃ البقرۃ کی آیت میں (النَّبِیّٖنَ) جمع سالم کا صیغہ لایا گیا اور ایسا کرنا دو لحاظ سے مناسب تھا:

(۱) نبیوں کے عزت وافتخار کی بنا پر۔

(۲) اس کلمہ میں ایک مدزائد ہے جو لفظ ''الحق'' میں الف لام کے اضافہ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

اور اب آیئے سورۃ آل عمران کی پہلی آیت کی طرف جس میں ''النَّبِیّٖنَ'' کہا گیا ہے' یہاں بھی مذکورہ دونوں اسباب پائے گئے:

(۱) نبیوں کے عزت وافتخار کی بنا پر۔

(۲) اس آیت کی ایک دوسری قراءت میں ''یَقۡتُلُوۡنَ'' کے بجائے ''یُقَاتِلُوۡنَ'' ہے' اور یہاں الف زائد ہے جو النبیّٖن کے مد کے مقابل لایا گیا ہے۔

آل عمران کی دوسری آیت جہاں لفظ ''الانبیاء'' جمع تکسیر کے ساتھ لایا گیا ہے وہاں صرف پہلا سبب یعنی انبیاء کا معزز ومکرم ہونا پایا گیا۔ عرب علم والوں اور غیر علم والوں دونوں کے لیے جمع تکسیر کا صیغہ کثرت سے استعمال کرتے ہیں' اور یہاں جمع تکسیر کا صیغہ لا کر گویا دونوں الفاظ کا بیان ہو گیا تاکہ ان لوگوں کے سامنے کوئی حجت باقی نہ رہے جو قرآن کی زبان کو چیلنج کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔ اب جبکہ قرآن ان کی ہی زبان میں اتارا گیا ہے اس لیے قرآن میں ان دونوں الفاظ کو لا کر انہیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ دونوں الفاظ تمہاری زبان کے ہیں' دونوں کا استعمال جائز ہے' اس لیے صرف ایک لفظ پر اقتصار نہیں کیا گیا تاکہ اعتراض کرنے والا یہ اعتراض نہ کر سکے کہ صرف ایک ہی لفظ کیوں لایا گیا جبکہ دوسرا لفظ بھی اس کے ہم معنی وہم پلّہ ہے۔ اعجازِ قرآن کے باب میں اس قسم کی مثالیں فہم وتدبر کے لیے بہت موزوں ہیں۔

(۱۹) آیت ۶۲:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ

صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴿۶۲﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی کہلائے اور نصاریٰ اور ستارہ پرست (ان میں سے) جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور نیک اعمال کیے' ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے' نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمزدہ ہوں گے۔''

سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۹ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴿۶۹﴾﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی کہلائے اور ستارہ پرست اور نصاریٰ' (ان میں سے) جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور نیک اعمال کیے تو ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمزدہ ہوں گے۔''

اور سورۃ الحج کی آیت ۱۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئِيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴿۱۷﴾﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی کہلائے اور ستارہ پرست اور نصاریٰ اور مجوسی اور جنہوں نے شرک کیا' بے شک اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔''

یہاں چار سوالات اٹھتے ہیں:

(۱) سورۃ البقرۃ میں نصاریٰ کا ذکر پہلے کیا گیا اور سورۃ المائدۃ میں بعد میں۔

(۲) سورۃ البقرۃ میں خاص طور پر یہ الفاظ وارد ہوئے: ''فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ''

(۳) سورۃ المائدۃ میں ''الصّٰبِئُوْنَ'' مرفوع (واؤ کے ساتھ) لایا گیا حالانکہ منصوب (ی کے ساتھ) ہونا چاہیے تھا۔

(۴) سورۃ الحج کی آیت میں نہ صرف مجوسیوں اور مشرکین کا اضافہ ہے بلکہ مضمون ہی دوسرا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ اصلاً اہلِ ایمان اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کا ذکر سب سے پہلے کیا جائے' کیونکہ پچھلی آیات میں انہی سے خطاب کا آغاز کیا گیا ہے' پھر اس کے بعد اہلِ کتاب کا درجہ ہے کہ ان کا ذکر مؤمنوں کے فوراً بعد آئے' کیونکہ وہ تمام رسولوں کے منکر نہیں تھے اور نہ ہی تمام سماوی کتابوں کے' اور اگر ان کے دین میں تغیر' تبدل اور تحریف نہ ہوتی تو وہ اہلِ ایمان سے قریب ترین لوگ تھے۔ بہرصورت وہ کفر اور نقضِ عہد کے مرتکب ہوئے۔ زمانہ کے اعتبار سے یہود کا زمانہ سب سے پہلے تھا۔ گو ان تینوں فریقوں میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں' ابتداءِ خلق اور معاد کے قائل ہیں' اپنے اپنے زمانے میں رسولوں کے آنے کے قائل ہیں' اور اسی لیے ان تینوں کا ذکر سب سے پہلے کیا جانا مناسب تھا۔

لیکن ملاحظہ ہو کہ یہاں ایسا حرف نہیں لایا گیا جس سے زمانی ترتیب مقصود ہو بلکہ مطلق ترتیب ہے' وہ اس لیے کہ غایت اور عاقبت کے اعتبار سے وہ سب برابر ہیں۔ یعنی ان میں کامیاب وہ لوگ ہیں جن کا اس

دارِ تکلیف (دنیا) میں خاتمہ ایمان اور اسلام پر ہوا' اور اللہ کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہی سب سے زیادہ قابلِ اکرام ہے۔ اور یہ کہ ان میں سے جس کا خاتمہ کفر پر ہوا وہ نارِ جہنم کا سزاوار ہو کر اپنے کیے کی برابر جزاء وسزا پائے گا۔ یہاں ان کا ذکر کرتے وقت ان کی دنیوی حالت کا اعتبار کیا گیا' اور ایسا کوئی حرف نہیں لایا گیا جس سے ان کی اخروی حالت کی طرف اشارہ ہو۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیوی اعتبار سے اہلِ کتاب (مؤمن' یہود' نصاریٰ) کا ذکر پہلے کیا گیا اور چونکہ صابی اہل کتاب میں سے نہیں ہیں اس لیے ان کا ذکر بعد میں کیا گیا۔

سورۃ المائدۃ میں صابی کا ذکر پہلے لا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ آخرت میں ایسی کوئی ترتیب نہیں ہوگی' صرف ایمان اور عملِ صالح کا اعتبار ہوگا۔ ان میں سے جو بھی صدقِ دل سے ایمان لے آئے گا وہ نجات پائے گا اور جو اپنے ایمان میں جھوٹا ہوگا وہ ناکام ٹھہرے گا۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایسی ہی بات ہے تو ان کا ذکر سب سے پہلے بھی کیا جا سکتا تھا؟ اس کے جواب میں' میں کہوں گا کہ اہل ایمان کے مرتبہ ومنزل کو دیکھتے ہوئے ایسا کرنا مناسب نہیں تھا' اور اگر یہ کہا جائے کہ کم از کم یہود سے پہلے ہی ان کا ذکر کر دیا جاتا تو میں جواباً کہوں گا کہ یہود تو وہ پہلے لوگ تھے جنہیں مخاطب کیا گیا تھا اور جن سے توقع کی گئی تھی کہ وہ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہوں گے' اور اسی لیے سورۃ البقرۃ میں متعدد آیات ان کے بارے میں وارد ہوئیں اور بتایا گیا کہ انہیں اپنے کفر وعناد کی بنا پر کیا کیا سزائیں بھگتنا پڑیں۔ اس لیے اہل ایمان کے فوراً بعد ان کا ذکر کرنا مناسب تھا۔

پھر اگر یہ کہا جائے کہ نصاریٰ بھی تو یہود جیسے ہیں' ان کا ذکر اس آیت میں صابی کے بعد کیوں کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نصاریٰ عقیدۂ تثلیث کی بنا پر صابی سے زیادہ قریب ہیں' یعنی دونوں اس طرح کی غلط سوچ رکھنے میں مماثلت رکھتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ ان آیات میں یہود کی طرح ان کا ذکر نہیں کیا گیا اور اس وجہ سے ان کے مقابلے میں یہود کا ذکر ہر صورت پہلے آنا چاہیے تھا۔ ہاں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان دونوں گروہوں میں یہود بدتر ہیں۔

دوسرا سوال کہ سورۃ البقرۃ میں ''فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ'' کا اضافہ ہے جو سورۃ المائدۃ میں نہیں پایا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ المائدۃ میں پہلے ہی اجر وثواب کا اتنا ذکر آ چکا ہے کہ مزید لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ﴿٦٥﴾﴾

''اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہوں کی تکفیر کر دیتے اور انہیں نعمتوں والی جنتوں میں داخل کر دیتے۔''

گویا یہاں البقرۃ کی مجمل آیت کا تفصیلی طور پر تذکرہ ہو گیا۔ اور اگر المائدۃ میں بھی ''فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ'' کہا جاتا تو وہ نہ صرف تکرار ہوتی بلکہ ایک تفصیلی بیان کے بعد دوبارہ اجمالی بیان ہوتا جو کہ غیر مناسب تھا۔

تیسرا سوال کہ المائدۃ میں ''الصّٰبِئُوْنَ'' مرفوع ہے حالانکہ اسے ''الصّٰبِئِيْنَ'' یعنی منصوب ہونا چاہیے تھا تو

اس کا جواب بھی یہی ہے کہ جیسے پہلے سوال کے جواب میں کہا گیا' یہ بتانا مقصود تھا کہ اخروی اعتبار سے اور نجات کے لحاظ سے تمام لوگ برابر ہوں گے۔ جو بھی ایمان اور عمل صالح میں مخلص ہوگا' اجر وثواب کا مستحق ہوگا۔ گویا ''صَابِئُوْنَ'' کو مرفوع لا کر یعنی ما سبق سے جدا کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ گروہ صَابِئِیْنَ کا معاملہ مختلف نہ ہوگا بلکہ جو معاملہ اہل ایمان' یہود اور نصاریٰ کا ہوگا وہی ان کا بھی ہوگا۔

سیبویہ (ف ۱۸۰ھ) کے نزدیک مؤخر کو مقدم لانے کی غرض یہ تھی کہ خاص طور پر اس گروہ کی طرف اشارہ ہو جائے کہ ان کا بھی یہی حکم ہے جو دوسروں کا ہے۔(۱)

الفراء (ف ۲۰۷ھ) کے نزدیک بھی جب ایک لفظ کا اعراب بدل جائے' یعنی سیاق سے اسے کاٹ دیا جائے (یعنی اسے منصوب ہونا چاہیے تھا لیکن مرفوع لایا گیا) تو یہ صرف کسی خاص امر کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہاں جو خاص امر ہے ہم اس کی طرف پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔

چوتھے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الحج میں تمام گروہوں کا بیان اس لحاظ سے ہو رہا ہے کہ قیامت کے روز کیسے ان کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا جبکہ سورۃ البقرۃ اور سورۃ المائدۃ کی آیات ان گروہوں کے بحیثیت اہلِ ایمان اٹھائے جانے کا ذکر ہے' یوں دونوں جگہوں پر مقصد کا اختلاف ہے' اس لیے مضمون کا بھی اختلاف ہے۔

(۲۰) آیت ۶۳:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ﴾

''اور جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا اور تمہارے اوپر (جبل) طور کو کھڑا کر دیا (اور کہا) کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرتے رہو۔''

پھر اسی سورت کی آیت ۹۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ﴾

''اور جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا اور تمہارے اوپر (جبل) طور کو کھڑا کر دیا اور (کہا) کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور سنو۔''

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ یہ دونوں آیات بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں لیکن پہلی آیت کا آخری ٹکڑا دوسری آیت کے آخری ٹکڑے سے مختلف ہے۔ پہلی آیت کے آخر میں ﴿وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ﴾ کہا گیا اور دوسری آیت کے آخر میں ﴿وَاسْمَعُوْا﴾ کہا گیا تو اس کا کیا سبب ہے؟ اور کیا پہلی آیت کے آخر میں ﴿وَاسْمَعُوْا﴾ اور دوسری آیت میں ﴿وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ﴾ کہا جا سکتا تھا؟

جواباً عرض ہے کہ ہر دو آیتوں کے آخر میں جو کہا گیا وہی اس آیت سے مناسبت رکھتا تھا۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلی آیت سے قبل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

(۱) صاحب الکشاف لکھتے ہیں کہ الصابئون کو مرفوع لا کر ان کی حیثیت کو علیحدہ سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ گویا اصل مضمون یوں تھا کہ اہلِ ایمان' یہود اور نصاریٰ بشرطِ ایمان اور عمل صالح جنت میں جائیں گے'' والصابئون کذلک'' اور یہی حال ستارہ پرستوں کا بھی ہوگا کہ وہ بھی ان دونوں شرطوں کے ساتھ جنت میں جانے کا استحقاق رکھیں گے۔ (مترجم)

﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ﴾ (آیت ۵۳)

''اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا کیا۔''

کتاب سے مراد تورات ہے جسے وہ سن چکے تھے اور جس کی طرف ﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ﴾ کہہ کر اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اور اس بات کو سورۃ الاعراف میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا' ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ (آیت ۱۷۱)

''اور جب ہم نے پہاڑ کو ان پر اس طرح کھڑا کر دیا گویا وہ ایک چھتری ہے اور انہیں یہ گمان ہوا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے (اور کہا) کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑلو۔''

''مضبوطی سے پکڑلو' اس لیے کہا گیا کہ جس چیز سے ڈرایا جا رہا تھا وہ ایک خوفناک منظر تھا' گویا پہاڑ ایک سائبان کی شکل میں ان کے اوپر گرا چاہتا ہے' اور اس پس منظر میں انہیں کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے اور جو کچھ اس میں دیا گیا ہے۔ اسے یاد کرتے رہنے کا حکم دیا گیا جو بالکل مناسب تھا۔ البتہ سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت کا سیاق وسباق مختلف ہے۔ اس آیت سے قبل ارشاد فرمایا:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ (آیت ۸۹)

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایسی کتاب آئی جو ان باتوں کی تصدیق کرتی تھی جو ان کے پاس تھیں۔''

اس کتاب سے مراد کتاب اللہ (القرآن) تھا اور جس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (آیت ۹۱)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے اتارا ہے اس پر ایمان لاؤ''

یعنی قرآن پر ایمان لاؤ' اور اس بات کی دلیل کہ یہاں ''بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' سے مراد قرآن ہے' ان کا ایمان سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے یہ کہنا ہے:

﴿نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ (آیت ۹۱)

''ہم تو اس پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اُترا ہے'

تو پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۤ﴾ (آیت ۹۱)

''اور وہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے بعد ہے۔''

یعنی ''قرآن مجید' اور پھر فرمایا:

﴿وَهُوَ الْحَقُّ﴾ (آیت ۹۱)

یہاں بھی قرآن ہی کی طرف اشارہ ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۹۱)

''جو تصدیق کرتا ہے اس کی جو ان کے پاس ہے (یعنی تورات)۔''

اب یہاں پہلے قرآن کا ذکر کیا گیا اور خطاب ان یہود سے ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ہم زمانہ تھے اور ان میں ایسے لوگ بہت کم تھے جو ایمان لائے اور قرآن کو دلجمعی کے ساتھ سنتے تھے' اور ان کی اکثریت کا قرآن کے سماع سے منہ پھیرنا اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ یہود کے اس گروہ کو 'وَاسْمَعُوْا'' کہہ کر خطاب کیا جائے' تاکہ اس واقعہ کو یاد کر کے اولین یہود کا تذکرہ بھی ہو جائے اور آخرین یہود کی حالت کی طرف اشارہ بھی ہو جائے اور یوں دونوں آیات کی مناسبت بھی' ظاہر ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر اس کا برعکس ہوتا تو وہ قطعاً غیر مناسب ہوتا۔

(۲۱) آیت ۸۰:

﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ﴾

''اور انہوں نے کہا کہ ہمیں آگ نہیں چھوئے گی مگر گنے چنے دنوں کے لیے۔''

اور سورۂ آل عمران کی آیت ۲۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠﴾

''اور یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں آگ نہیں چھوئے گی مگر گنے چنے دنوں کے لیے۔''

اب ان دونوں میں موصوف (اَیَّام) تو ایک ہی لفظ ہے لیکن وصف میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں (مَعْدُوْدَۃٍ) مفرد کا صیغہ ہے اور آل عمران میں (مَعْدُوْدَاتٍ) جمع کا صیغہ ہے' تو یہ اختلاف کیوں واقع ہوا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ الف اور تاء کے ساتھ جمع کا صیغہ چار طرح کا ہو سکتا ہے' جن میں سے تین پر اتفاق ہے اور چوتھے میں اختلاف ہے۔

تین متفق علیہ کی تفصیل یوں ہے:

(۱) ہر مؤنث کا اسم علم' جیسے ھند اور دَعْد

(۲) ہر وہ اسم جس میں تاء تانیث ہو' چاہے وہ مرد کے لیے ہو یا مؤنث (عاقل اور غیر عاقل) دونوں کے لیے جیسے طلحہ' حمزۃ' شَجَرَۃ۔

(۳) غیر عاقل اسم کا مصغر' جیسے دُرَیْھَم کی جمع دُرَیْھَمَات وغیرہ

اور چوتھی مختلف فیہ قسم یہ ہے:

ہر وہ اسم مکبّر جو غیر عاقل کے لیے ہو' چاہے مذکر کا صیغہ ہو یا مؤنث کا' اور اہل عرب سے اس کی جمع تکسیر نہ وارد ہو' جیسے: حَمّام کی جمع حَمّامات' سَبْطر کی سَبْطرات' سَبَحل کی سَبَحلات' شرادق کی شرادقات' ایوان کی ایوانات' رَبَحل کی جمع رَبَحلات۔ لیکن اگر عربوں سے ایسے کسی لفظ کی جمع تکسیر سنی گئی ہو تو پھر اسے الف اور تاء کے ساتھ جمع نہیں کیا جا سکتا۔

ابن سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جَوَالق کی جمع جوالیق سنی گئی ہے اور اسے الف اور تاء کے ساتھ جوالقات نہیں کہا گیا۔ لیکن 'عیدات'' مؤنث کے صیغے کے ساتھ کہا گیا ہے اور اسے جمع تکسیر کے صیغے کے ساتھ نہیں لایا گیا' حالانکہ اس طرح کے الفاظ میں جمع تکسیر لائی جاتی ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ہر مؤنث کی صفت میں تانیث کا حکم جاری رہتا ہے سوائے چار اقسام کے:

جو فُعْلٰی فَعْلان کے صیغہ پر ہو

یا فُعْلٰی اَفْعَل کے صیغہ پر ہو

یا وہ الفاظ جو دونوں مذکر اور مؤنث کے لیے مستعمل ہوں' جیسے مِعْطَار ' مِذْکَار ' مِیْنَاث

یا وہ الفاظ جو صرف مؤنث ہی کے لیے خاص ہیں' جیسے حَائِض ' طَامِث

تو ان چاروں اقسام کی جمع الف اور تاء کے ساتھ نہیں آ سکتی' لیکن باقی ان تمام اسماء کی آ سکتی ہے جن میں مؤنث کی صفات پائی جائیں۔

پھر وہ الفاظ جو مذکر ہوں لیکن غیر عاقل کے لیے بولے جائیں اور ان کی جمع تکسیر کی گئی ہو تو ان کی صفت مفرد تائے تانیث کے ساتھ لائی جاسکتی ہے' جیسے ذُنُوبٌ مَغفورۃٌ ' اَعْمَالٌ محسُوبَۃٌ۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فِیْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ⑬ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ⑭ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ⑮ وَّزَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ ⑯﴾ (الغاشیة)

اور اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ نے یہود کا یہ قول نقل کیا ہے:

﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ﴾

اور یہ بھی جائز ہے کہ ایسے کسی لفظ کی جمع اس کے مفرد کا لحاظ کرتے ہوئے' الف اور تاء کے ساتھ کی جائے۔ گو ایسا کثرت سے نہیں دیکھا گیا لیکن پھر بھی اسے فصیح قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۰۳)

''اور اللہ کو چند گنے چنے دنوں میں یاد کرو''۔ (یعنی یہاں مفرد (مَعْدُودة) کی جمع لائی گئی ہے۔)

اب اس وضاحت کے بعد ہم کہیں گے کہ سورۃ البقرۃ کی آیت میں اختصار کا پہلو ہے اور سورۃ آل عمران میں طوالت کا۔ سورۃ البقرۃ میں صرف ان کا قول بتایا گیا لیکن اس کا سبب نہیں بتایا گیا۔ سورۃ آل عمران میں قول نقل کرنے کے بعد اس کا سبب بھی بتایا گیا۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَغَرَّهُمْ فِیْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ㉔﴾

''اور انہیں ان کے دین کے بارے میں جس چیز نے دھوکہ دیا وہ یہ تھا کہ وہ لوگ جھوٹ باندھا کرتے تھے۔''

اس لیے یہ کہنا بالکل مناسب ہے کہ جہاں اختصار غالب تھا وہاں مفرد کا صیغہ (مَعْدُوْدَة) لایا گیا اور جہاں طوالت تھی وہاں جمع کا صیغہ (مَعْدُوْدَات) لایا گیا۔ اور اگر سورۃ البقرۃ میں جمع کا صیغہ یا آل عمران میں مفرد کا صیغہ' یا دونوں میں خالی افراد یا خالی جمع کا صیغہ لایا جاتا تو وہ بالکل غیر مناسب تھا' واللہ اعلم!

(۲۲) آیت ۹۴ اور ۹۵:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ㉔ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢبِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ﴾

’’کہہ دیجیے اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ دارِ آخرت اللہ کے پاس صرف تمہارے لیے ہے تمام دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر تو پھر اگر تم سچے ہو تو موت کی خواہش کرو۔ اور وہ ہرگز ایسا نہ کریں گے بوجہ اس کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔‘‘

اور سورۃ الجمعہ کی آیت ۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ﴾

’’اور وہ پھر کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے بوجہ اس کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔‘‘

اب سوال یہ ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے لیکن سورۃ البقرۃ میں ’’وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ‘‘ کہا گیا‘ جبکہ سورۃ الجمعہ میں ’’وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗ‘‘ کہا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ سورۃ البقرۃ میں مستقبل کے صیغے کے ساتھ جو کہا گیا وہ ایک ایسی بات کے جواب میں کہا گیا جو آخرت سے یعنی مستقبل سے متعلق ہے اور وہ بات بھی ایسی ہے جو صرف وہم وگمان کے درجہ کی ہے کہ آخرت میں معاملہ ایسے ہوگا‘ اس لیے ان کی بات کی نفی کے لیے بھی وہ حرف استعمال کیا گیا جو مستقبل میں نفی کے لیے استعمال ہوتا ہے‘ گویا سَيَفْعَلُ (وہ ایسا کرے گا) کی نفی لَنْ يَّفْعَلَ (وہ ہرگز ایسا نہ کرے گا) کہہ کر ہو سکتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں سورۃ الجمعہ میں وارد لفظ (وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗ) ان کے اس گمان کا جواب تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اللہ کے ولی ہیں اور اس بات کا تعلق دنیا سے ہے‘ ان کے موجودہ حال سے ہے جس کا مستقبل سے کوئی تعلق نہیں‘ اس لیے اس کے جواب میں ’’لَا‘‘ کا حرف لایا گیا جو عمومی نفی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ’’لَا‘‘ اور اسی طرح ’’مَا‘‘ کا حرف حال کی نفی کے لیے مستعمل ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ ’’مَا‘‘ حال کی نفی کے لیے خاص طور پر آتا ہے تو یہاں ’’مَا‘‘ کا حرف زیادہ موزوں تھا تو جواباً کہوں گا کہ ’’مَا‘‘ سے مطلق حال کی نفی تو مراد ہو سکتی ہے لیکن ’’حال‘‘ سے متصل زمانے کی نفی مراد نہیں ہوتی‘ جیسے اگر یہ کہا جائے: ’’مَا يَقُوْمُ زَيْدٌ‘‘ (زید کھڑا نہیں ہوتا ہے) تو یہاں یہ معنی نہیں لیا جا سکتا کہ وہ کل بھی کھڑا نہیں ہوگا۔

برخلاف یہود کے اس گمان کے‘ کہ وہ اللہ کے ولی ہیں اور اس طرح اپنی ساری زندگی ولی رہیں گے اور اسی لیے وہ اپنے زعم کے مطابق تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف دارِ آخرت کے وارث ہوں گے۔ اور اس کیفیت کی نفی کے لیے جو ان کے حال اور حال سے متصل زمانے پر محیط ہے‘ لَا کا حرف لایا گیا تاکہ اس بات کی تاکید ہو جائے کہ وہ نہ صرف اب یہ تمنا نہ کر سکیں گے بلکہ اس زمانہ حال کے بعد بھی ایسی تمنا نہ کر سکیں گے۔ اگر تم یہ کہو کہ یہ مفہوم تو ’’اَبَدًا‘‘ کے لفظ سے حاصل ہو جاتا ہے تو ہم کہیں گے کہ ان کی تمنا کی نفی کے لیے تو ’’لَا‘‘ کا حرف کافی تھا لیکن ’’اَبَدًا‘‘ کہہ کر اس بات کی مزید تاکید کر دی گئی اور اس طرح یہ بات بلاغت کے اعلیٰ درجات کو چھو گئی۔ واللہ اعلم!

(جاری ہے)

❁❁❁